خلیفہ صاحب کا فلسفۂ مذہب

محمد انور خلیل

''اسلام کا نظریۂ حیات'' میں خلیفہ عبد الحکیم فرماتے ہیں کہ ''مذہبی زندگی سپردگی کی زندگی ہے ۔ یہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے ، شخصی خواہشات کو غیر شخصی عقل کے ، بے قدر کو قابل قدر کے ، دنیا کو آخرت کے، جزوی کو کلی کے تابع کرنے کا نام ہے (۱)۔ حیات کی غایت '' لطف اندوزی یا الم پروری نہیں بلکہ اس کو اس طرح بسر کرنا ہے کہ آنے والا کل ، گذرنے والے آج سے بہتر ہو ۔ حیات کی اصل غایت اصلاح ہے ۔ ظاہر اور باطن میں زندگی سکون نا آشنا ہے۔ ہر اعتبار سے اس کا وجود ایک رزم گاہ ہے '' (۲) ۔ خیروشر یا خوب و ناخوب کے تصادم سے اس کی داستان خونچکان ہے ۔ حیات کا مقصد بیرونی اور اندرونی تنازعوں پر غالب آنا ہے ۔ '' امن کا آرزومند ہونا انسان کی فطرت ہے ۔ اس لئے ہر دو وجود اسلام یا امن کا آرزو مند ہوتا ہے '' (۳) ۔ امن ، سلامتی یا خوشحالی ، مسرت ، ترقی ۔ یہ ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں ۔ یہی ہیں وہ مقدمات جن سے خلیفہ عبدالحکیم ایک نئے علم کلام کی داغ بیل ڈالتے ہیں ۔ اس وقت دنیا کو واقعی ایک نئے علم کلام اور نئے فلسفۂ مذہب کی ضرورت ہے جو تجریدی بحثوں سے زیادہ حقیقی انسانی زندگی کے مسائل سے عبارت ہو ۔ خلیفہ صاحب کے مذہبی اور فلسفیانہ افکار میں ہمیں ایک نیا اسلوب ملتا ہے جس کا اطلاق وہ دور حاضرہ کے مسائل پر کرتے ہیں ۔ آج کے انسان کے پاس سب کچھ ہے مگر اس کے وجود میں بے شمار رخنے ہیں ، اس کے شعور میں انتشار ہے ، وہ پارہ پارہ ہو چکا ہے اور اس کی شخصیت کی جگہ بہت سے چھوٹے چھوٹے خانوں نے لے لی ہے جن کا آپس میں کوئی ربط نہیں ہے ۔ اگر ہم ارتقا کے نقطۂ نظر سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ ارتقا جس کی خصوصیت تنوع ، ارتباط اور تنبیت ہے انسان کی سطح پر آکر بہت زیادہ عرصے تک اپنی اصل صورت قائم نہ رکھ سکا ۔ چنانچہ موجودہ دور میں آکر ایک بے لگام ، خود رو اور بے ہنگم روحانی تصادم میں انحطاط پذیر ہوگیا ہے ۔ انسان کی تمام حیات آفرین قوتوں کا رخ سائنس اور فنیات کی طرف مڑ گیا ہے اور عام ترقی محض مادی خوشحالی کے آدرش میں تبدیل ہوچکی

---

۱ خلیفہ عبد الحکیم ، اسلام کا نظریۂ حیات ۔ ۱۲۱
۲ ایضاً ۱۳۲
۳ ایضاً ۱۳۵

ہے ۔ ذہن و جسم ، روح و مادہ پر مشتمل ناقابل تقسیم وحدت میں سے صرف جسم ، مادہ اور مدار کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی ہے ۔ اگر یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو انسانیت کا مستقبل کیا ہوگا ؟ اگر سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی اور روحانیت کی نفی کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا رہا تو بنی نوع انسان کا کیا حشر ہوگا ؟ اجتماعی شعور کی غیر فطری تقسیم نے جو کرب پیدا کیا ہے اس کی تلافی کا کیا امکان ہے ؟ مادی ترقی کی دوڑ میں کچلی جانے والی روح کا کیا علاج ہو سکتا ہے ؟ یہ اور ایسے ہی سینکڑوں سوال ہیں جو آج کے انسان کو پیش ہیں ۔

بنی نوع انسان کو اس داخلی اضطراب و خلجان سے نجات دلانے میں مذہب ایک بڑی قوت بن سکتا ہے لیکن سیاسی گروہ بندی کی طرح مذہبی فرقہ واریت نے کل انسانیت کو باہم دست و گریبان جماعتوں میں بدل دیا ہے ۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ مذہب اپنی اصل میں ایک متحد رہنے اور متحد رکھنے والی قوت ہے ۔ لیکن تاریخ ایسے ہلاکت خیز واقعات سے بھری پڑی ہے جن کی بنیاد مذہبی منافرت پر رہی ۔ تاریخ مذاہب میں یہ ایک ایسا تضاد ہے جس کا رفع کرنا فلسفہ' مذہب کا اولین منصب ہے ۔ کیا کوئی ایسا مذہب ممکن ہے جسے کل انسانیت کا مذہب کہا جا سکے؟ ایک ایسا عالمگیر مذہب جو تمام مذاہب کی ایک وحدت ہو ، جو کل انسانیت کے لئے ایک مکمل ضابطہ' حیات بن سکے ، جس کے اصول معروضی ہوں ، ہمہ گیر ہوں ؟ مذہب کا مستقبل انسانیت کا مستقبل ہے۔ اگر متنازع مذاہب ایک ہمہ گیر نظام دین میں منظم ہو سکتے ہیں تو بنی نوع انسان کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ۔

خلیفہ عبدالحکیم کی فکری کاوشوں کا بیشتر حصہ اسی ایک بنیادی مسئلہ کی عقدہ کشائی ہے ۔ ان کے فلسفیانہ تاملات کا مقصد ہمیشہ یہ رہا کہ عالمگیر مذہب کے بنیادی اصولوں کو اس طرح اجاگر کیا جائے کہ وہ اتنے ہی قابل یقین ہوں جتنے کہ سائنسی حقائق ۔ چنانچہ دین و دانش کے مسائل پر گہری نظر رکھنے والے ہم عصر حکما میں خلیفہ صاحب اپنے تصور مذہب کے لحاظ سے ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اقبال کی طرح وہ بھی یہ پختہ عقیدہ رکھتے تھے کہ تقلید پرستی اور مذہب کے ثانوی پہلوؤں پر زور دینے سے انسانیت باہم متخالف گروہوں میں بٹ جاتی ہے اور مذہبی تعصب و تعذیب کا ذریعہ بنتی ہے (۴) ۔ جہاں تک ظاہری رسوم کا تعلق ہے مختلف قوموں کا مذاق مختلف ہے مگر مذہب ایک بلند تر شئے ہے، یہ ایک مکمل ضابطہ' حیات ہے۔ ایسا ضابطہ' حیات جس میں کوئی سخت گیری نہیں ۔ خلیفہ صاحب کی فکر میں ہمہ گیر مذہب

---

۴ ۔ خلیفہ عبد الحکیم ' اسلام کا نظریہ' حیات ' ص ۱۵۰

ایک آزادانہ نظم ہے جو مختلف حالات و کوائف ، مختلف اقوام و ملل کے مخصوص تجربات سے مطابقت رکھنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ مذہبی زندگی کا باطن وہ بیمثال جزئیت ہے جو کلیت کی تلاش میں ہر مزاحمت میں سے اپنے لئے راستہ نکال لیتی ہے -

کل انسانیت تمام تفصیلات میں کسی ایک سلسلہ' رسوم کی پابندی نہیں کر سکتی - مذہبی اعمال میں اختلاف تا ابد جاری رہے گا - لیکن اس کے باوجود دنیا کی تمام قوموں کو جس طرح عالمگیر امن اور خیر خواہی کے لئے چند بنیادی اصولوں پر متحد ہونے کی دعوت دینا زمانہ کا تقاضہ ہے اسی طرح ایک عالمگیر مذہب کے بنیادی اصولوں کو پوری انسانیت کے سامنے پیش کرنا بھی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے- یہی وجہ ہے کہ باوجود مذہبی رواداری کے اعلیٰ مسلک کے ، انسان مذہبی اضافیت کے اصول کو اپنا نہیں سکتے کیونکہ یہ اصول بہ باطن اتحاد انسانی کے منافی ہے - اعلیٰ مذہب کا تقاضہ ہی یہ ہے اور خود انسانی برادری کے آفاقی تصور میں یہ امر پنہاں ہے کہ ایسے عالمگیر اصول موجود ہیں جن پر تمام انسانوں میں باہمی توافق حسنہ و تعامل خیر پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی عالمگیر مذہب ہے جو اضافی مذاہب سے ارفع ہے۔ مگر آجکل کسی عالمگیر مذہب کے محض امکان کے متعلق سوچنا بھی بظاہر نری خیال آرائی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ماضی میں بنی نوع انسان کبھی ایک مذہب کے پیرو نہیں رہے اور آج بھی وحدت انسانی کثرت مذاہب سے پاش پاش ہے۔ پھر یہ مذاہب بذات خود بے شمار فرقوں میں تقسیم ہیں - خلیفہ صاحب کہا کرتے تھے کہ اس تقسیم کی سب سے بڑی مثال عیسائیت ہے - عیسائیت میں فرقہ بندی کا یہ عالم ہے کہ صرف امریکی مردم شماری میں تین سو سے زیادہ فرقوں کا ذکر کیا گیا ہے - ہندو مت بھی بے شمار عقائد اور رواجوں کے لئے ایک مجموعی نام ہے۔ ہندو مت کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ اس میں کوئی مشترک عقیدہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی مردم شماری میں لفظ '' ہندو،، کی تعریف صرف منفی طور پر کی گئی ہے - یعنی ہندوستان کا ایسا باشندہ جو مسلمان ، عیسائی یا بودھ نہ ہو وہ '' ہندو،، کہلاتا ہے - بودھ مت بھی بہت سے فرقوں میں تقسیم ہے اور روحانیت اور مہاتما بدھ کی الوہیت کی تکریم ہی ان فرقوں کو یکجا کئے ہوئے ہے - خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ اسلام میں بھی فرقے موجود ہیں مگر ان فرقوں کے ما بین اختلافات کی نوعیت سیاسی یا فقہی ہے - سارے فرقے اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں لہذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلام میں ایسے فرقوں کا وجود نہیں ہے جن کے درمیان کوئی واضح حد فاصل ہو۔ شیعوں کے نزدیک رسول اکرم کے بعد منصب خلافت حضرت علی کو ملنا چاہئے تھا، انتخاب یا چناؤ کے ذریعہ نہیں بلکہ نبی اکرم سے روحانی قربت کی وجہ سے

ان کے خیال میں خلافت یا امامت کا حق روحانی وراثت کے طور پر منتقل ہونا چاہئے تھا ۔

بہر حال اگر انسان کے کلی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مذہبی فرقوں اور عقائد کی نامعقول اور افسوسناک جنگ کے اندوھناک مناظر بنی نوع انسان کے اتحاد اور استحکام پر یقین رکھنے والوں کے لئے ہر زمانہ میں حقیقی مسئلہ رہے ہیں ۔ اس سلسلہ میں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ روحانی مذاہب کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جاتا اور ان پر عمل کیا جاتا تو یہ واقعہ انسانیت کی شیرازہ بندی کے لئے ایک عظیم قوت ثابت ہوتا ۔ انسان اپنی روح کو پالیتا اور اپنی منزل و مقصد کو پہنچ جاتا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس سطحی مذہبیت نے انسانوں کو انسانوں سے متصادم کیا ہے اور آج بھی خام مذہبیت کی وجہ سے انسان ایک دوسرے سے کٹے ہوئے ہیں ۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ سائنس جس کا کوئی مذہب نہیں اور ٹکنالوجی جو سائنس کے اطلاق سے پیدا ہوئی دنیا کو ایک بنا چکے ہیں لیکن انسان کے اتحاد کی راہ میں دو قوتیں حائل ہیں: ایک تشدد آمیز مذہب جو حق و صداقت اور نجات کی ٹھیکیداری کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسری تنگدلانہ قوم پرستی جس کی بنیاد زبان ، نسل یا جغرافیائی وحدت پر ہوتی ہے ۔

مجلس اقوام کا تصور بیسویں صدی کی ہلاکت خیزیوں کے درمیان پہلا جھجکتا ہوا قدم تھا جس کا مقصد اقوام عالم کے لئے ایک مشترک پلیٹ فارم بنانا تھا تاکہ وہ آپس کے معاملات میں اخلاقیت کے اصول اپنا سکیں اور خود کو ان کا پابند رکھ سکیں۔ لیکن ہر قوم میں ذاتی خود سری کی جڑیں اتنی زیادہ گہری تھیں کہ اس کو کسی واحد عالمگیر ضابطہ اخلاق کا پابند بنانا مشکل تھا چنانچہ بیس سال کے عرصہ میں قومیں ایک دوسرے سے پھر ٹکرائیں اور پوری قوت سے ٹکرائیں ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اب صورت یہ ہے کہ سائنس اگر یہ واضح نہ کر چکی ہوتی کہ یا تو دنیا میں جنگ نہیں ہوگی یا پھر پوری انسانیت مٹ جائے گی تو تیسری جنگ بھی چھڑ چکی ہوتی۔ اس وقت اگر باھمی کشیدگی کے باوجود جنگ نہیں ہوتی تو اس لئے نہیں کہ قوموں کی خود سری یا خود غرضی میں کمی ہوئی ہے بلکہ اس لئے کہ سائنسی ایجادات کی ہلاکت آفرینی نے انہیں دہشت زدہ کر دیا ہے ۔ اس وقت جب کہ معلمین اخلاق انسان کی سرشت بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے سائنس کی خالص مادیت کامیاب ہو چکی ہے ۔ چنانچہ شاید اب عالمی جنگ نہیں ہوگی کیونکہ سائنس آئندہ کی جنگ اس انداز سے پیش کرتی ہے کہ نہ فاتح رہیگا نہ مفتوح ۔ جیسا کہ اوپر گزرا کسی روحانی قدر نے نہیں بلکہ ہلاکت کے خوف نے امن کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ جنگ کے اسباب جوں کے توں موجود ہیں ۔ یہ منفی قسم کا امن کسی پائیدار

انسانیت کا ضامن نہیں ہو سکتا ۔

تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں مذہب سے مدد لینی چاہئے؟ انسانیت کی تاریخ میں مذہب کے وظیفہ کا جائزہ لیتے ہوئے خلیفہ صاحب واضح کرتے ہیں کہ کوئی ایسا مذہب جو بہت سی جنگوں کا سبب بنا ہے انسانوں کو متحد نہیں کر سکتا ۔ خلیفہ صاحب بطور خاص واضح کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے دوسرے مذہب کے پیروؤں کو نیست و نابود کرنے یا انہیں اپنا مذہب قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لئے کبھی جنگ نہیں کی ۔ کبھی کبھی مسلم فرقوں میں کشیدگی بھی پیدا ہوئی ہے اور ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے اور تکلیف پہنچانے کے اکا دکا واقعات بھی ہوئے ہیں لیکن اسلام کے کسی فرقے کے لوگ اس مقصد سے کبھی جمع نہیں ہوئے کہ کسی دوسرے مذہب یا کسی دوسرے مسلم فرقے کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں اس وجہ سے اسلام عالم انسانی کی وحدت کے لئے مثبت اساس کا کام دے سکتا ہے ۔

تاریخ کے تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی جنگیں صرف یورپ کی تاریخ کا ہی خصوصی باب ہیں ۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے کبھی کسی مذہب کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی ۔ جب عرب کے نیم مہذب قبیلے خود اسلام کو تشدد سے نیست و نابود کرنے کے لئے برسر پیکار ہوئے تو ان مسلمانوں نے مدافعانہ جنگیں کیں ، یہاں تک کہ وہ محفوظ و مامون ہوگئے ۔ اس امن کو انہوں نے مذہبی آزادی اور رواداری کے لئے استعمال کیا ۔ اس کے بر خلاف روما میں مذہبی آزادی کبھی نہیں تھی اور پوری مسیحی دنیا دو سو سال تک محض اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لئے مسلح ہو کر حملہ آور ہوتی رہی ۔

مسلمان یا عیسائی ماضی میں کچھ ہی کرتے رہے ہوں مگر آج عام انسان کی ذہنیت اس حد تک بدل چکی ہے کہ مذہبی جنگیں ممکن نہیں رہی ہیں ۔ عالمی امن کے حصول کی راہ میں یہ بھی یقیناً قابل تعریف قدم ہے ۔ لیکن مسلح جنگ کے امکان کا ختم ہو جانا ہی کافی نہیں ہے ۔ ایک دوسرے سے الگ رہنے کا رجحان، جذباتی بیگانگی اور چھپی ہوئی دشمنی بدستور موجود ہیں۔ ہر صاحب عقل، ہر صاحب نظر اور ہر محب انسانیت اس صورت حال کو یقیناً تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے ۔

صدیوں کے ذہنی نشو و نما اور معروضی فکر کے بعد طبیعی فطرت کی ایک ایسی سائنس کا وجود ممکن ہو گیا ہے جسے ہر قوم کے سائنس دان احترام کی نظر سے دیکھتے ہوں ۔ تمام قوموں کے لئے ایک سیاسی پلیٹ فارم حقیقت بن چکا ہے۔ قوموں اور افراد کے بنیادی حقوق ہر قوم نے تسلیم کرلئے ہیں البتہ اس میں ابھی وقت لگے گا کہ عملاً ہر جگہ ان کا احترام ہونے لگے ۔ کیا مذہب کے معاملہ میں بھی کسی ایسے سمجھوتے کا امکان ہے ؟ انسانی ذہن جس نے ایک

متحد رہنے اور متحد کرنے والی سائنس اور ٹکنالوجی کی تخلیق کی اور جس نے انسان کے بنیادی حقوق پر سمجھوتہ کرانے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی امن کے تحفظ کے لئے ایک ادارہ کو وجود بخشا ' بین المذہبی کشیدگی کو اگر ختم نہیں کرسکتا تو کم از کم اس کا زور ضرور توڑ سکتا ہے اور بین المذہب ہی خیر کاری کے فروغ کے لئے مثبت قدم بھی اٹھا سکتا ہے ۔

خلیفہ صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ قومیں اور مذہبی عقیدے اور فرقے تاریخ انسانی کے تمام دیگر واقعات کی طرح بالاخر انفرادی اور سماجی نفسیات کی تخلیق ہیں - تاریخ کی بالفعل قوتیں ہر دور کے ساتھ بدلتی رہی ہیں اور مذہبی معتقدات و رسوم کو متغیر کرنے والے نفسی و سماجی معطیات بھی تغیر پذیر رہے ہیں - جو چیز خود تغیر کی پیداوار ہو اس کے مزید تغیر کے امکانات ختم نہیں ہوسکتے۔ یہاں جس سوال کا جواب درکار ہے وہ یہ ہے کہ مذہب کے معاملے میں تنگدلانہ فرقہ پرستی سے کسی قسم کی آفاقیت و ہمہ گیری کی طرف نشو و نما کا کوئی عمل آہستہ آہستہ رونما ہوا ہے یا نہیں ؟

خوش قسمتی سے ہم اس سوال کا جواب اس بات میں دے سکتے ہیں - ایک وہ وقت تھا جب ہر قبیلہ کے خود اس کے ذاتی دیوتا ہوتے تھے جو اس قبیلہ سے تو شفقت اور محبت رکھتے لیکن باقی تمام دیوتاؤں اور ان کی پرستش کرنے والوں کے دشمن ہوتے - اس مرحلہ پر مذہب اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاقیت کی نوعیت قبائلی تھی - ان دیوتاؤں کو عظمت اس لئے ملتی تھی کہ وہ پورے قبیلے کی اجتماعی انا کے مظہر سمجھے جاتے تھے۔ یہ دیوتا خود آپس کے جھگڑوں کے ساتھ ساتھ اپنے عبادت گذاروں کی جنگوں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے - بنی اسرائیل کا ارتقا' اس دور سے اگلا قدم تھا - یہ بنی اسرائیل کے مذہبی شعور کی نشو و نما تھی جس نے اپنے ارد گرد کے قبائل کے دیوتاؤں کو کم تر درجے کا ٹھہرا کر انہیں چھوڑنے میں پہل کی اور بالاخر ان کے وجود ہی سے انکار کر بیٹھے - اب صرف ایک خدا باقی تھا ، عالم فطرت اور عالم انسان کا خالق اور رب -

بے شمار دیوتاؤں کے تصور کے خاتمہ نے انسانیت کو ایک بنانا شروع کیا کیونکہ ایک ایسی منظم دنیا کا تصور ممکن ہوسکا جس کا مبدا ایک خالق اعلیٰ کی مشیت تخلیق ہو اور جسے برقرار منظم رکھنے والی قوت بھی اس کی ذات یکتا ہو - لیکن انسان کے قدیم قبائلی رجحان کی جڑیں بہت گہری تھیں اسے پوری طرح دبایا نہ جا سکا - اس رجحان کی وجہ سے وہ ایک خدا بھی جو قادر مطلق اور عالم کلی ہونے کی حیثیت سے عالمگیر اور آفاقی ہے محض ایک خاص قوم کی تقدیر سے سروکار رکھنے والا سمجھا جانے لگا۔ ''منتخب قوم،، یا ''برگزیدہ بندوں،، کے تصور نے الہیت کی وسیع و عریض عمارت میں قبائلیت کے داخلے کے لئے چور

دروازہ کھول دیا اور خدا بایں وجہ عالمگیر نہ رہا بس واحد و بر تر ذات کے طور پر باقی رہا جس کا کام اپنے ماننے والوں کو برتری دلانا تھا۔ چنانچہ توحیدی مذاہب آپس کی دشمنی میں ان کثرت پرستانہ مذاہب کو پیچھے چھوڑ گئے جنہوں نے دوسرے قبائل کے دیوتاؤں کے ساتھ رفتہ رفتہ رواداری کا سلوک شروع کر دیا تھا ۔ خدائے واحد ان کے ہاں ایک جابر فرمانروا یعنی رب العساکر بن گیا ۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی جنگ کو دیکھئے اور اسلام کے ماننے والوں کے ساتھ ان دونوں کے ٹکراؤ پر نظر ڈالئے ۔ اگر خدا صحیح معنوں میں کل بنی نوع انسان کا پالن ہار ہے تو وہ بنی نوع انسان کے ایک بڑے حصے کے ساتھ سوتیلی اولاد کا سا سلوک نہیں کر سکتا اور نہ نسل انسانی کے اتنے بڑے حصے کو محض دوزخ کا ایندھن بنانے کے لئے تخلیق کر سکتا ہے ۔ عالمگیر مذہبی شعور کا سنگ بنیاد اس اصول کو بنایا جا سکتا ہے ۔ چنانچہ اس کی روشنی میں خلیفہ صاحب بنی اسرائیل کے مذہبی شعور کے ارتقا کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہودی ذہنیت کی جڑیں منتخب قوم یا برگزیدہ بندوں کے تصور میں پیوست ہیں گو ان کے بڑے بڑے پیغمبر اخلاقیاتی اصولوں کی عظمت کا درس دیتے تھے لیکن یہ اخلاقیاتی اصول بھی یہودیوں کو زیادہ تر ان کی اپنی امت کی تقدیر سے متعلق نظر آتے ہیں ۔ ان کے ہاں خدا کو بھی خاص طور سے ان ہی کے رنج و راحت سے سروکار رہتا ہے ۔ اسرائیلی پیغمبروں میں حضرت عیسیٰ غالباً سب سے زیادہ عالمگیر انسانیت کے داعی تھے۔ خلیفہ صاحب نے جس بصیرت اور روشن ضمیری کے ساتھ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اور نصرانیت کے ارتقا کا جائزہ عالمگیر مذہب کے نقطۂ نظر سے اپنے مقالۂ غیر مطبوعہ (Is Universal Religion Possible?) میں کیا ہے وہ مذہبی ادب میں اپنی نظیر آپ ہے ۔ خلیفہ صاحب حضرت عیسیٰ کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ ان کی روحانیت کا دائرہ بہت وسیع تھا اور یہ بڑی روحانی اور اخلاقی اصلاح کا باعث بنا ۔ لیکن انجیل مقدس میں بعض ایسے بیانات بھی ہیں جو ان کی وسعت نظر اور محبت و شفقت سے متوافق نہیں ہیں ۔ مثلاً یہ اشتعال انگیز بیان کہ میں اپنے بچوں کا کھانا کتوں کے آگے نہیں ڈال سکتا ۔ اس بیان میں کتوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت عیسیٰ کی قوم (بنی اسرائیل) یا امت میں شامل نہ ہوں ۔ ایسے بیانات حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے اس قدر متخالف ہیں کہ آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یا تو یہ اصل بیانات کی تحریف ہیں یا بعد کا اضافہ ہیں ۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات نہ صرف رواداری بلکہ دشمن تک سے مثبت اور تخلیقی شفقت و محبت کا درس ہیں ۔ دشمن سے محبت کا سبق ایک دنیا دار عمل پسند انسان کے لئے ایک ایسی خام خیالی کی حیثیت رکھتا ہے جو افراد اور اقوام کی زندگی میں کسی عملی افادیت کا حامل نہیں ہو سکتا لیکن تصور اور مثال کی ماہیت ہی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حقیقت

اور واقعہ سے آگے رہتا ہے ۔ تمام صحیح اخلاق اور روحانی ترقی اور عالمی امن کے فروغ کے امکانات کا رخ اسی طرف ہوتا ہے جس کی نشاندھی اس کی عینیت میں ہوتی ہے ۔ اگر عیسائیت کی نشو و نما اپنے خطوط پر ہوتی جو حضرت عیسیٰ نے متعین فرما دئے تھے تو یہ بنی نوع انسان کے لئے نعمت عظمیٰ ثابت ہوتی لیکن افسوس کہ ان کے ماننے والوں نے کلیسا کے جنگی نظام کی بنیاد ڈالی اور اس کا جواز انجیل مقدس سے پیش کیا۔خود حضرت عیسیٰ کا قول ہے کہ میں امن نہیں تلوار لے کر آیا ہوں ۔ سامراجی روم کی طاقت جس لمحہ عیسائیت کی حامی بنی اسی لمحہ سے عیسائیت رومی سامراجیت کے سانچوں میں ڈھلنا شروع ہوئی اور رومن کیتھولک چرچ نے خود کو اقتدار کی جنگ کے قالب میں ڈھال لیا ۔ مظلوم ومغلوب ظالم وصالب بن گئے اور انہوں نے آزادیٔ ضمیر کا گلا گھونٹ دیا۔ احتساب خانوں میں رونگٹے کھڑے کر دینے والی اذیتیں امن کے اس علمبردار کے نام پر روا رکھی گئیں جس نے بدی پر محبت سے فتح پانے کا سبق دیا تھا اور تشدد سے منع فرمایا تھا ۔

عیسائیت بھی '' منتخب قوم '' یا '' برگزیدہ بندوں '' کے تصور کا شکار ہو گئی۔ اب عیسائیت کے ہیرو منتخب قوم یا برگزیدہ بندے قرار پائے ۔ مذہب ایک عالمگیر انسانی مظہر کے طور پر نشو و نما پانے کی بجائے تاریخ کا ایک واقعہ بن کر رہ گیا۔ کلیسائی ازعانات میں جنہیں خود حضرت عیسیٰ جیسا وحدانیت پسند بھی نہ سمجھ پاتا ایک طرف تو یہودیت کے اثرات ہیں اور دوسری طرف یونانی و رومی اصنام پرستی کی سمیت ہے ۔ روما میں ہیروؤں اور شہنشاہوں کو دیوتا بنا کر پوجنے کا رجحان ہمیشہ سے رہا ہے ۔ لہذا جب عیسائیت رومی علاقوں تک پہنچی تو حضرت عیسیٰ کو خود اللہ تعالیٰ کے مماثل قرار دینا مشکل نہ ہوا ۔ خدا کی موت اور اس کی دوبارہ حیات کے بت پرستانہ تصورات کو کلیسائی عیسائیت کے اندر داخل ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ تجسیم، مصلوبیت، کفارہ، حضرت عیسیٰ کی پیدائش اور موت کے معجزے ، یعنی سریت پسندی اور یونانی ما بعد الطبیعیات کے ساتھ ساتھ رمز پرستی عیسائیت کی مرکزی صداقتیں قرار پائے ۔ حضرت عیسیٰ ان تمام باتوں کو یقیناً کفر قرار دیتے ۔ ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آتی کہ خدا کی ماں یا خدا کی موت جیسی اصطلاحات کا بھی وجود ہو سکتا ہے ۔ وہ انسان کے گناہوں سے عفو و درگذر اور رحمت و شفقت کی صورت میں تو خدا کو دیکھ اور سمجھ سکتے تھے لیکن ایسا خدا ان کے نزدیک پرلے درجہ کی حماقت سے زیادہ نہ ہوتا جو ایک انسانی جسم کا قالب اختیار کر لے اور انسانی گناہوں کی پاداش میں مارا جائے ۔ خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس تفصیل کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ کی خالص وحدانیت جس میں خدا کا لازمی وصف عالمگیر رحمت و شفقت تھا

تنگدلانہ یہودی تصور کی باقیات اور اصنام پرستانہ سریت اور ما بعد الطبیعیات سے ملوث نہ ہو جاتی تو شائد مذہبی ذہنیت رکھنے والی پوری انسانیت کا دین بن جاتی -

عیسائیت اپنے ابتدائی دور میں زندگی کے ساتھ منفی رویہ اختیار کرنے کے سبب رہبانیت پسند ہوگئی جب کہ جنت اور دوزخ اس دنیا سے الگ، زمان و مکان سے ماوریٰ اور کوئی طبعی مقام نہیں ہے - جنت تو خود انسان کی روح اور اس کے دل میں ہے اور حضرت عیسیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ جو لوگ اس کو اپنائیں گے وہ دنیا کی نعمتوں سے محروم نہیں رکھے جائیں گے کیونکہ روح اور دل میں دنیا کی ہر نعمت سما سکتی ہے - ان کا مقصد اس سے یہ تھا کہ تمام اقدار ایک قدر یعنی صفائی قلب میں سمو دی جائیں- اگر زندگی کی نعمتوں کو بالذات مقصد بنا لیا جائے اور انہیں وسیلہ سمجھنے کی بجائے بالذات داخلی قدر کا حامل ٹھہرایا جائے اور ہر چیز کی انتہا ان ہی میں تلاش کی جائے تو نعمتیں نعمتیں نہیں رہتیں کیونکہ جو لوگ صرف ان نعمتوں کو ہی زندگی سمجھتے برھیں وہ ان کے حصول کی کوشش میں زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں - اس کے عکس جو لوگ اصل اور حقیقی زندگی کو اپنا مقصد بناتے ہیں ان کے لئے مادی نعمتیں محض ذریعہ ہوتی ہیں مقصد نہیں- گویا سوال اولیت کا ہے یعنی وہ کیا چیز ہے جسے قدر اعلیٰ کے طور پر سب سے پہلے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے -

قدر ایک مجرد تصور ہے- مجرد تصورات کی تشریح کرنا یا ان کے متعلقات کی وضاحت کرنا نہایت دشوار ہے کیونکہ وہ تمام الفاظ جو مجرد تصورات کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں ایک مفہوم تو رکھتے ہیں لیکن ان کا مصداق نہیں ہوتا - بر خلاف اس کے جو الفاظ مقرون اشیاء کی نمائندگی کرتے ہیں ان کی تشریح میں کوئی دشواری نہیں ہوتی - میں جب قلم کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس کی تشریح ضروری نہیں ہوتی - ہر شخص آسانی سے میرا مفہوم سمجھ جاتا ہے - لیکن سچائی اور نیکی جیسے مجرد تصورات تشریح طلب ہوتے ہیں- یہ ضرور ہے کہ سچائی اور نیکی کے الفاظ ہم مختلف مواقع پر مختلف سیاق میں استعمال کرتے اور سنتے رہتے ہیں ، اس لئے ان کے مفہوم کا ایک خاکہ سا ہمارے ذہن میں ضرور ہوتا ہے لیکن اگر لفظ '' نیکی '' کے مکمل مفہوم کو بیان کرنے کے لئے ہم سے کہا جائے تو ہمیں احساس ہوگا کہ ہم جس لفظ کو بظاہر آسان سمجھ رہے تھے اور جس کے مفہوم کے متعلق ہمارے دل میں پہلے کوئی شبہ بھی نہیں تھا وہ واقعتاً کتنا پہلو دار ہے - قدر کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے - ہم جب قدر کا لفظ سنتے یا بولتے ہیں تو ہمارے ذہن میں کوئی نہ کوئی مفہوم ضرور ہوتا ہے لیکن جب ہم اس مفہوم کے بیان کی طرف آتے ہیں تو وہ ہلکا سا

خاکہ بھی اڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو تشریح کی ذہنی کوشش سے پہلے موجود تھا - اس دشواری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم مجرد تصورات کو ان مقرون ٹھوس اشیا' ، واقعات یا حقائق کے حوالے سے ہی سمجھ سکتے ہیں جن میں اس مجرد تصور کا کوئی نہ کوئی پرتو نظر آتا ہو - مثلاً جب ہم قدر کی گفتگو کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں خود قدر نہیں بلکہ قابل قدر یا قدر کی حامل اشیا' ، واقعات یا اصول ہوتے ہیں اور ہم انہی کو قدر کی تشریح کےلئے استعمال کرتے ہیں گویا اقدار کی یافت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ طبیعی دنیا میں ظاہر نہ ہوں اور انسان خود بھی طبیعی دنیا کا ایک حصہ ہے لہذا کوئی مذہب جو اس دنیا سے ماورا کسی اور دنیا تک محدود رہتا ہو صحیح معنوں میں مذہب نہیں ہو سکتا - عیسائیت دوسری دنیا سے سروکار رکھ کر اس دنیا کے باسیوں کے لئے مذہب کی حیثیت سے کسی مقام کی مستحق نہیں رہتی حالانکہ حضرت عیسیٰ کوئی ماورائی صوفی نہیں تھے اور نہ ان کا نقطہ' نظر ماورائی نقطہ' نظر تھا - ایک عالمگیر رحمت و شفقت کے طور پر خدا کے تصور سے جو حضرت عیسیٰ کا تھا منفی سریت اور رہبانیت کا تصور کسی طرح پیدا نہیں ہوتا -

خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ خدا کی لافانی اور لامتناہی رحمت و شفقت تخلیقی رحمت و شفقت ہی ہو سکتی ہے۔ ایسی رحمت و شفقت جو ان ہستیوں کی تخلیق کر رہی ہو جو اس رحمت و شفقت کی معروض بھی ہوں اور موضوع بھی - خدا اور ان ہستیوں کے درمیان ایک شخصی اضافت و نسبت ہونی چاہئے لیکن اضافتیں اور نسبتیں خلا میں موجود نہیں ہوا کرتیں - ان کے لئے اشیا' اور ہستیوں کے عوالم کی ضرورت ہوتی ہے - اگر عالم روح عالم غایات ہے تو ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جو ان غایات کی تکمیل کے لئے وسائل فراہم کرسکے - یہ عالم فطرت کو عالم وسائل سمجھا جا سکتا ہے - تخلیقی محبت و شفقت کو ایسے جمال کی تخلیق کرنی چاہئے جو صورت و اشکال میں ظاہر ہو سکے - چنانچہ ایک صحت مند انسانی جسم خدا کی تخلیقی محبت کا انتہائی جمیل اور قابل تعریف شاہکار ہوتا ہے - وہ سریت پسند جو روحانی نشو و نما اور بقول خود اپنی نجات کی خاطر فاقہ کشی کرتا اور اذیت کوشی اختیار کرتا ہے گمراہ ہو چکا ہے - وہ جسم کو اذیت پہنچا کر روح کو بھی تباہ کرتا ہے کیونکہ یہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ حضرت عیسیٰ ذہنی اور جسمانی طور سے بہت صحت مند انسان تھے ، ان میں زندگی و صحت کی وہ فراوانی تھی کہ محض ان کی موجودگی یا ذرا سا لمس مرتے ہوؤں کو جلا دیتا - وہ امراض کے نہیں ذہنی اور جسمانی

---

۵ Khalifa A. Hakim, "Is Universal Religion Possible ?"
ایک غیر مطبوعہ مضمون -

صحت کے مسیحا تھے -

یہ واقعہ مذہبی تاریخ کے عظیم ترین المیوں میں سے ایک ہے کہ ابتدا ہی سے حضرت عیسیٰ کو سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے - یہودی پیشواؤں نے جو تمام اصلاحی پیغمبروں کے ہمیشہ دشمن رہے حضرت عیسیٰ کو کافر اور باغی قرار دیا کیونکہ ان کی تعلیم یہ تھی کہ قانون انسان کے لئے بنایا گیا ہے، انسان قانون کے لئے نہیں بنایا گیا -۶ نتیجیت کو آسمانی مذاہب کا حریف سمجھ لیا جاتا ہے لیکن حضرت عیسیٰ کی شکل میں ہمیں ایک عظیم نتیجت پسند نظر آتا ہے جو اشیاء کی صداقت کو صرف اقدار حیات کی کسوٹی پر پرکھتا ہے - ولیم جیمز اور اس جیسے نتیجت پسندوں نے جو کچھ کیا وہ اتنا کہ حضرت عیسیٰ کے اس اصول یا حکیمانہ قول کی فلسفیانہ تشریح کر دی کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے - تنگ دل اور کٹر یہودی علما جن کے لئے مذہب بڑی حد تک ایک بے مغز چھلکا تھا ایک ایسے شخص کو نہ سمجھ سکے جس کے نزدیک روح کی آزادانہ زندگی ہی صحیح مذہب تھی اور جیسا کہ انجیل مقدس کے مندرجات سے واضح ہو جاتا ہے کہ خود حضرت عیسیٰ کے قریب ترین حواری بھی انہیں نہ سمجھ سکے- وہ انہیں ایک قسم کا ایسا عظیم جادوگر سمجھتے تھے جو انسانوں کے جسم سے برائیاں نچوڑ کر ان برائیوں کو معصوم جانوروں کے جسم میں پھونک دے اور جانور ان برائیوں کے ساتھ سسک سسک کر ختم ہو جائیں - حضرت عیسیٰ کی روحانیت کل مخلوق سے بے حد و حساب محبت و شفقت کے علاوہ کچھ نہیں - لیکن اگر ان کے حواری ان کی اس روحانیت کا عشر عشیر بھی سمجھ لیتے تو ایسے بے رحمانہ فعل کو ان سے منسوب نہ کرتے - کیا کوئی روحانی انسان انجیر کے درخت کو محض اس لئے بد دعا دے سکتا ہے کہ وہ طبیعی اسباب کی بنا پر بے برگ و بار ہے اور اس نے اسے مایوس کیا ہے؟ یہ حواری ان کی عالم جنت کی تشبیہ کو بھی سمجھ نہ سکے اور اس کے متعلق بچگانہ اور احمقانہ سوال کرتے رہے - انجیل مقدس کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھایا گیا تو یہی حواری مبہوت ہو کر رہ گئے اور جب قبر میں اتار دئے جانے کے تین دن بعد انہوں نے حضرت عیسیٰ کو زندہ سلامت چلتے پھرتے اور قبر کو خالی دیکھا تو انہیں ہوش آیا اور وہ پھر حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آئے - انہوں نے اسے ایک غیر معمولی واقعہ سمجھا اور موت پر حضرت عیسیٰ کی فتح کا ثبوت قرار دیا - انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ ایسا واقعہ ہے جو نہ صرف ولیوں اور بزرگوں کو بلکہ عام انسانوں کو بھی پیش آچکا ہے - اس کے بعد کہا گیا کہ انہیں آسمان پر اٹھا لیا

Khalifa A. Hakim, "Is Universal Religion Possible ?" ۶ غیر مطبوعہ مضمون

گیا ہے کیونکہ انہیں مقدس باپ کی طرف لوٹنا تھا اور مقدس باپ کا مسکن آسمان ہے ۔ حضرت عیسیٰ کے حواری قابل معافی ہیں کیونکہ قدیم ابتدائی مذہبی شعور کا عام حکم اسی قسم کا تھا ۔ لیکن آپ جدید تعلیم یافتہ پوپ کے متعلق کیا کہیں گے جو بیسویں صدی کے وسط میں تمام کیتھولک عیسائیوں کو حکم دے کہ آج سے سب اس بات پر ایمان لے آئیں کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم کو بھی آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا؟ مجھے حیرت ہے کہ حضرت عیسیٰ کو ذہنی اور عقلی ترقی کے اس روشن دور میں بھی بہتر طور پر نہیں سمجھا گیا ۔

کیا سینٹ پال نے انہیں سمجھ لیا تھا ؟ سینٹ پال یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے ۔ خلیفہ صاحب کے تجزیہ کے مطابق وہ اپنے بیشتر ہم عصروں کی طرح یونانی ما بعد الطبیعیات ، کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے ۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ کی شخصیت ما بعد الطبیعیات، غناسطی داستانوں اور اسرار کا لبادہ اڑھا دیا اور اس طرح ان کی پرستش کو دین بنا دیا ۔ کلیسائی عیسائیت کا بڑا حصہ سینٹ پال کی تخلیق ہے ۔ چنانچہ باطنی و سٹری عقائد کے ماننے والے برگزیدہ بندے کہلائے ۔ تجسیم ، گناہ آدم کی پاداش میں کفارہ ، ترک دنیا ، گناہ اول اور تثلیث پر ایمان نجات کی لازمی شرط ٹھہرا۔ حضرت عیسیٰ کی حیات بخش روحانیت اور صحت مند اخلاقیت اس پالینیت میں دفن کر دی گئی ۔ صرف چند آزاد خیال عیسائی تھے جنہوں نے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اور زندگی کی ابدی اقدار کو بے جان متعقدات کے اس ڈھیر سے پھر کرید نکالا جس میں یہ دوہزار سال سے دبی ہوئی تھیں۔ ان آزاد خیال عیسائیوں کے لئے حضرت عیسیٰ پھر وہی اسرائیلی پیغمبر بن گئے جو وہ حقیقتاً تھے ۔ ایک ایسے پیغمبر جس نے الوہیت کا دعویٰ کبھی نہیں کیا ، جس نے بلندیٔ کردار کا مظاہرہ کیا اور اسی کی تعلیم دی ، جس نے مادہ پر روح کو ترجیح دی ، جس نے ظاہری باتوں کی اہمیت کو نظر انداز کرنا سکھایا ، جس نے ظاہری کردار سے زیادہ توجہ کے قابل نیت اور رویہ کو ٹھہرایا ، جس نے محبت و شفقت کو قانون پر فوقیت دی اور جس نے خدا کو عالمگیر رحمت و شفقت کے عین قرار دیا۔ انسانیت کے لئے اس سے بہتر مذہب کیا ہو سکتا ہے ؟ لیکن قدامت پسند اور استنادی عیسائیت کے نزدیک یہ انتہائی نا کافی ہے ۔ وہ حضرت عیسیٰ کی ارفع و اعلیٰ انسانیت سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی جب تک کہ وہ خدائے تعالیٰ سے عین نہ ہو اور جب تک کہ حضرت عیسیٰ کی موت و حیات انسان کے زوال اور شفاعت کے کائناتی نظام کا تکملہ نہ سمجھی جائے ۔

کلیسائی عیسائیت کے ممتاز اور مخصوص عناصر ایسے ہیں کہ پوری بنی نوع

---

۷ غیر مطبوعہ مضمون Khalifa A. Hahim "Is Universal Religion Possible ?"

انسان تو کجا خود روشن خیال اور اعتدال پسند عیسائیوں کے لئے بھی قابل قبول نہیں ہیں ۔ یہ ہیں وہ بنیادی وجوہات جن کی وجہ سے یہودیت اور عیسائیت بنی نوع انسان کی حقیقی شیرازہ بندی کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں ۔

مگر جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں خلیفہ عبدالحکیم کا یہ یقین محکم ہے کہ ایک عالمگیر مذہب کے بغیر حیات کا ارتقا اپنی کلیت کے ساتھ جاری نہیں رہ سکتا اس لئے تمام انسانوں کے لئے ایک ایسا مذہب ناگزیر ہے جس کی بنیاد معروضی ہو اور جو اس منتشر مخلوق کو اس کی تمام تر گوناگونی اور رنگینی کے ساتھ ایک راستہ اور ایک مقصد کی یگانگت میں پرو سکے ۔

انہوں نے عالمگیر مذہب کی لازمی خصوصیات یہ بیان کی ہیں :—

۱ ۔ یہ ایمان کہ وجود کی بنیاد روحانی اور خدا حیات کی روح تخلیقی ہے ۔

۲ ۔ انسانی روح روح الٰہی کا جزوی مظہر ہے ۔

۳ ۔ خدا ، کل موجودات کی کائناتی روح اور کائنات میں جاری و ساری ہونے کے باوجود اس سے ماورا ہے ۔ خدا کائنات سے اس سے بھی زیادہ قریب ہے جتنا کہ کوئی فنکار اپنی تخلیق سے ہوتا ہے مگر وہ اپنی مخلوق سے ماورا رہتا ہے کیونکہ اس کی ہستی امکان ظہور کے ہر مرحلے پر اپنی تمام تخلیقات سے بے انتہا عظیم ہے ۔

۴ ۔ صفات خداوندی کو اپنانا انسان کا مقصود ہے ۔ خدا چونکہ سراپا نور و عشق ہے اس لئے علم میں اضافہ اور اس کے ساتھ ساتھ محبت و شفقت میں اضافہ انسان کو خدا سے زیادہ سے زیادہ قریب کرتا جاتا ہے ۔

۵ ۔ صرف حسی ادراک اور منطقی استدلال ہی علم کا ذریعہ نہیں ہیں ۔ حقیقت کی ایسی جہتیں بھی ہیں جو ماورائے حس و عقل ہیں انسانی روح ایک ارفع و اعلیٰ سطح پر ان جہتوں سے رابطہ پیدا کرکے وہ حیات اور نور حاصل کر سکتی ہے جس سے بحر و بر نا آشنا ہیں ۔ چنانچہ وحی ایک حقیقت ہے ۔

۶ ۔ کسی وحی یا کشف میں اگر داخلی تضاد ہو یا اگر وہ باقاعدہ طور پر ثابت شدہ حقائق کے بالکل متضاد ہوں تو اس پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی اجازت ہے چنانچہ متضاد الہامات میں سے کسی ایک پر صحیح کا حکم لگانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ غیر جانبدار عقل سے مدد لی جائے اور زندگی کی داخلی انسانی اقدار

---

۸ غیر مطبوعہ مضمون "Khalifa A. Hakim, "Is Universal Religion Possible ?

کو سامنے رکھا جائے کیونکہ نوربسیط اور عقل کے فیصلوں کے درمیان درمیان کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ اگر کوئی الہام انسانیت کے مطلق اقدار کی نفی کرتا ہے تو اس کو صحیح تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ان اقدار کا سر چشمہ اور ان کی تکمیل خدا ہے ۔ مذہب بہر حال نام ہے اقدار کی بقا پر ایمان کا ۔

۷ - اگر کوئی مذہب ارتقا کے عام تصور سے مخالف سمت میں جاتا ہے تو اسے عالمگیر قبولیت حاصل نہیں ہو سکتی ۔ آج ارتقا کے تصور کا وجود کہ ہر مظہر پر اطلاق ہمہ گیر طور پر صحیح سمجھا جاتا ہے ۔ وہ مادی اور حیاتی صورتیں جو آج نظر آتی ہیں ارتقا کے ایک طویل عمل کی پیداوار ہیں ۔ چاہے نظام شمسی ہو چاہے انسانی جسم ، ان کی موجودہ صورت یقینی طور پر زمان میں ہوئی ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کی اصل ابتدا کو ابھی سائنسی طور پر سمجھا نہ جا سکے یا اس کا عملی تظاہر ممکن نہ ہو ۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ زمین پر زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب حالات اس کے لئے سازگار ہو گئے ۔ نبض حیات کی ابتد جس یک خلیاتی جسم میں ہوئی وہ کروڑوں سال کے بعد اپنی اعلیٰ ترین شکل میں انسانی عضویہ میں ظاہر ہوئی ۔ الغرض زندگی کی کوئی صورت بیک جنبش وجود میں نہیں آئی ۔ حیات کی اصل و ابتدا اور اس کی نشو و نما میں تغیر و تبدل کے عمل کے متعلق اختلاف رائے ہے چاہے اس کو میکانکی کہا جائے یا بروزی یا تخلیقی یہ سب اختلافات اس واقع کی تعبیر و تشریح کے اختلافات ہیں جو خود ناقابل تردید ہے ۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی خدا پرست یہ عقیدہ رکھے کہ حیات کا کل عمل خدا کا مقرر کردہ ہے ، اور خدا ہی اس نظام کو چلاتا ہے یا یہ کہ حیات تخلیقی خدا ہی ہے ۔ لیکن ایک عقل پسند اور سائنسی دور کی ذہنی فضا میں کوئی ایسا نظریۂ کائنات یا ما بعد الطبیعیات قابل قبول نہیں ہو سکتا جو ارتقا کے واقعہ کو نظر انداز کر جائے ۔

۸ - جو مذہب عالمگیر بننا چاہتا ہے اس کے لئے یہ عقیدہ بھی ناگزیر ہے کہ بنی نوع انسان رنگ ، نسل یا مذہب کے اختلاف کے باوجود ایک مستحکم اور متحد اکائی ہیں ۔

جس طرح ایک صحیح مذہب کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ '' برگزیدہ بندوں ،، یا '' محبوب قوم ،، کے تصور سے دامن بچائے ، اسی طرح اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی نسل کے موروثی طور پر اعلیٰ یا موروثی ادنیٰ ہونے

کے غلط عقیدہ کو بھی قابل مذمت ٹھہرائے۔ تمام انسان ذھنی اور جسمی ساخت لیز وظیفے اور جبلی اعتبار سے بنیادی طور پر یکساں ھیں۔ ماحول کی طرف سے اثر انداز ھونے والے عوامل اور تاریخ کے اعمال ھیں جو اس بنیادی یکسانیت میں عادات و اطوار اور رسوم و رواج کی گوناگوں صورتیں پیدا کر دیتے ھیں - ایک انگریز بچہ کو اگر پیدائش کے فوراً بعد نیگرو ماحول میں رھنے بسنے والے نیگرو والدین کے سپرد کر دیا جائے تو وہ بچہ اپنے نقطۂ نظر اور اپنی سیرت کے اظہار و اعتبار سے ایک نیگرو کی طرح نشو و نما پائے گا ، اس کی زندگی میں انگریز تہذیب کے سماجی ورثے کا کوئی شائبہ نہیں پایا جائے گا - اسی طرح اگر انگریز معاشرے میں ایک نیگرو کو یکساں مواقع فراھم رھیں اور اس کے ساتھ مساویانہ انسانی برتاؤ روا رکھا جائے تو وہ شرح ذھانت کے معاملے میں انگریز بچوں سے پیچھے نظر نہیں آئے گا - یہ واقعہ جو سائنسی اور عمرانی طور پر ثابت ھو چکا ھے ھر جگہ کے لئے اعلیٰ مذھبی شعور کے لئے بھی ھمیشہ ایک مسلمہ اصول رھا ھے - آپ مہاتما بدھ کی سری ما بعد الطبیعیات کے بارے میں کچھ بھی سوچیں ان کی تعلیمات کے متعلق یہ بات ناقابل انکار ھے کہ وہ ھندؤں کے ذات پات کے کٹر نظام کو قابل نفرت سمجھتے تھے ، وہ مساوات پسند تھے اور یہی سب سے بڑی وجہ ھے کہ برھمن نے جب اپنی برتری خطرے میں پڑتے دیکھی تو بدھ مت کو پورے برصغیر سے نکال باھر کرنے پر تل گیا - حضرت عیسیٰ بھی اس عقیدہ سے متفق نہیں تھے کہ یہودی موروثی طور پر دوسروں سے افضل ھیں - ان کے نزدیک تمام انسان خدا کے بچے ھیں - حضرت آں صلعم نے بڑے فخر کے ساتھ اعلان کیا کہ بنی نوع انسان سب ایک دوسرے کے مساوی ھیں - انہوں نے اسی کی تعلیم دی اور اسی پر عمل بھی کیا - آپ نے آخری خطبہ میں فرمایا :

"کوئی عربی عجمی پر اور کوئی عجمی عربی پر فوقیت نہیں رکھتا ، خدا کی نگاہ میں بر تر وہ ھے جو برتر سیرت کا مالک ھو - "

یہ ایک سچے اور عالمگیر مذھب کی خصوصیات ھیں - یہ ممکن ھے کہ مختلف نظام ھائے مذھب آپس میں اختلاف کرتے رھیں کیونکہ وہ نظام مذھب کی عقلی صورت گری اور منطقی تشکیل کی متفرق کوششیں ھیں اور حقیقت و صداقت کی ماھیت کے متعلق خیال آرائیاں انسانی عقل اور تخیل کی فطرت میں داخل ھیں - عام مذھبی زندگی کا رنگ بھی ایک قوم سے دوسری قوم تک اور ایک دور سے دوسرے دور تک بدلتا رھتا ھے اور مذاھب کے الگ الگ ڈھانچے مختلف خاکے اور مختلف نمونے اور مختلف لائحہ عمل بھی پیش ھوتے رھتے ھیں - لیکن اگر مذھبی شعور کی جڑیں ایک معروضی حقیقت سے پھوٹی ھیں اور وہ محض ایک ایسا موضوعی یا سماجی مظہر نہیں ھے جس پر صرف روایت

تاریخ اور غیر عقلی قوتوں کا غلبہ ہو ۔ مذہب کی حیثیتیں گو مختلف ہوتی ہیں مگر اس کی جڑیں ہمیشہ ایک ایسے شعور میں ہوں گی جو انسانوں کی تفریق سے پاک ہوگا ۔

خلیفہ صاحب نے خدا کے تصور کے ارتقا کے بارے میں بصیرت افروز باتیں کہی ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ خدا کا تصور ارتقا کے ایک طویل اور مسلسل عمل سے گذرا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا اس ارتقائی عمل کی پیداوار ہے ۔ طبیعی سائنس جسے مذہبی شعور کے مقابلے میں زیادہ حقیقی سمجھا جاتا ہے وہ بھی ایک طویل ارتقائی عمل کی پیداوار ہے لیکن کوئی مادیت پسند یا فطرت پسند سائنسدان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ سائنس انتہائی آغاز کے زمانے میں بھی ایک واقعی حقیقت سے بحث کرتی تھی ۔ فطرت خود اپنے قوانین سمیت ہمیشہ موجود ہے ، اختلاف اس کے متعلق خیال آرائیوں میں رہا ہے ۔ اسی طرح مذہبی شعور نے بیداری کے انتہائی اولین دور میں یہ محسوس کر لیا تھا کہ تمام فطری مظاہر کی پشت پر کوئی ایسی اعلیٰ قوت کام کر رہی ہے جو روح انسانی سے بے اندازہ عظیم ہونے کے باوجود انسان کے لئے غیر نہیں ہے ۔ انسانی فکر اور تعقل ابتدا میں حیویتی اور تجسمی تھا لیکن اس اولین دور میں بھی انسان بالکل گمراہ نہیں تھا ۔ فطری سائنسوں نے اپنی ترقی کے ساتھ رفتہ رفتہ فطرت کو غیر شخصی بنا دیا لیکن یہ صرف طریقہ کار کی آسانی اور عملی افادیت کی خاطر کیا گیا تھا ۔ جب یونانی سوفسطائی پروٹا گورس نے کہا کہ انسان کائنات کا پیمانہ ہے تو اسے ایک ما بعد الطبیعیاتی اور مذہبی کفر قرار دیا گیا ۔ لیکن آج آئنگٹین جیسے سائنسی فلسفی اسی مقام کی طرف لوٹ گئے ہیں ۔ انہوں نے یہ ثابت کرنا شروع کر دیا ہے کہ اپنی غیر شخصی نوعیت سمیت سائنس انسانی ذہن کی تشکیل ہے اور کائنات کا جو خاکہ حواس اور سائنس فراہم کرتے ہیں وہ ایک حقیقت مطلق کا آئینہ دار نہیں ہے بلکہ انسانی ذہن کی نتیجتی ضرورتوں کا عکس ہے ۔ یہ کانٹ تھا جس نے انسان کو تمام مدرکہ حقیقت کے مرکز پر لا کھڑا کیا ۔ ہم ایک دی ہوئی معروضی اور پابند نظام فطرت کے قوانین دریافت نہیں کرتے بلکہ اسے قوانین دیتے ہیں ۔

اس طرح مادی کائنات کے متعلق خیال آرائی تھیلز اور انکسا غورس جیسے ابتدائی یونانی مفکروں کے آب حیویتی نظریہ سے شروع ہو کر حیویت، تجسیم اور غیر شخصی میکانیکی مادیت سے ہوتی ہوتی رفتہ رفتہ پھر انسان کی طرف لوٹ آئی ہے اور انسان ایک دفعہ پھر خود کو اس فطرت کا مخرج و منبع قرار دینے لگا ہے جسے وہ معروضی اور منظم فطرت سمجھتا ہے ۔ سائنس نے مسلسل ترقی اسی لئے کی ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ منظم فطرت کا وجود ہے اور اس کے راز ہائے سربستہ کو رفتہ رفتہ علم کی صورت میں پا لینا ممکن ہے ۔

جس طرح طبعی فطرت کی تعبیر و تفہیم میں تغیر اور ارتقاء کے باوجود انسان کے حواس اور عقل کو اس کی معروضی حقیقت پر مکمل یقین رہا ہے اسی طرح مذہبی شعور یا تو واقعی تجربے کے ذریعہ یا عقیدے کے سہارے سے وجود کی ان دیکھی اور اعلیٰ و افضل روحانی بنیاد کو حقیقی سمجھتا رہتا ہے - فلاطینوس کی قسم کی سرّی ما بعد الطبیعیات نے خدا کو ایک ایسی ہستی سمجھا جو اپنی ابتدائی اصل میں تو ہر صفت سے منزّہ و ماوریٰ تھی لیکن جو ایک تنزیلی پیمانہ پر ظہور کے ذریعہ تمام ہستیوں ، اشیاء اور صفات کی خالق ہے -

یہودیت، عیسائیت اور اسلام نے اس حقیقت مطلق کو ایک منزّہ شخصیت سمجھا اور اسے علم ، ارادہ اور حرکت سے متصف جانا - بدھ مت اور ویدانتی ہندو مت نے اس کو غیر شخصی تصور کیا ، لیکن سب اس بات پر متفق تھے کہ انائے انسانی خود کو اس کے علم اور اس کے منشاء کے عین بنا کر اپنی حدود سے باہر نکل سکتی ہے- ہر مذہبی شعور کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ انفرادی نفس کو حقیقت مطلق کے تابع کیا جائے ، اس حقیقت مطلق کے تابع جو ایک نفس اعلیٰ تصور کی جاتی ہے یا جسے وجود کے تمام معقولات ماوریٰ وجود کی بنیاد سمجھا جاتا ہے - تمام مذاہب اس ہستی کو انسان کا مقصد اعلیٰ سمجھتے ہیں اور سب اس بات پر متفق ہیں کہ اس ہستیٔ مطلق کے تابع ہونے سے زیادہ وسیع وجود اور زیادہ حقیقی زندگی کے دروازے کھل جاتے ہیں -

مختلف اخلاقی اور ذہنی سطح کے انسان اس ہستی کا تصور مختلف طریقے پر کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک ہی مذہبی فرقے کے افراد کا طرز فکر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے - اس اختلاف کی ضرورت بھی ہے - سائنس کی ترقی طرز فکر کی آزادی ہی کا نتیجہ ہے - اوپر سے تھوپی جانے والی یکسانیت ، عقلی اور مذہبی ، دونوں شعبوں میں انسانی روح کو مفلوج کرکے رکھ دیتی ہے - لہٰذا ہر وہ مذہب جو تمام آزاد انسانوں میں مقبول ہونا چاہتا ہے اسے یہ آزادی دینی پڑے گی - طبیعی فطرت کے بارے میں بھی انسان کا طرز فکر کئی طرح کا ہوتا ہے - فیثا غورث نے حقیقت مطلق کو اپنی اصل میں ریاضیاتی تصور کیا اور ہر شے کو اعداد کا حامل قرار دیا - دو ہزار سال تک فطرت کے مطالعے اور اس کے متعلق خیال آرائی کے بعد سائنس کے فلسفی جیمس جینز نے اس مذہب کو پھر زندہ کیا - افلاطون کے نزدیک خدا تصورات کا ایک ایسا اہرام تھا جس کا نقطۂ راس خیر کا تصور تھا - ارسطو کے لئے خدا ایک خود نگران فکر (معروض و موضوع) کا ایک مکمل وجود اور مادے کے بغیر صورت خالص تھا - اسرائیلی پیغمبروں کے لئے خدا اپنی اصل میں ایک آمر تھا جو اپنے احکام کی فرمانبرداری یا ان سے نافرمانی پر انعام و سزا دیتا ہے -

خدا کا تصور اور اس کے متعلق خیال آرائیاں مستقبل میں بھی اسی طرح

بدلتی رہیں گی جس طرح کہ ماضی میں۔ حقیقت لامتناہی اور پہلو دار ہے لہٰذا اس کے متعلق طرز ہائے فکر بھی بے شمار اور مختلف ہونا فطری ہے - بہت سے خدا پرستوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ خدا کے متعلق اس طرح گفتگو کرتے رہتے ہیں جیسے خدا کو پوری طرح جان لیا گیا ہے یا اس کا مکمل علم ممکن ہے۔ مشہور صوفی حلاج نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ معلوم ، ذہن عالم سے ہمیشہ کم ہوتا ہے کیونکہ معلوم ، ذہن عالم کا مظروف ہوتا ہے اور ظرف اپنے مظروف سے بہر حال وسیع تر ہوتا ہے ۔ لہٰذا خدا کو سمجھنے کے لئے خود انسانی شعور ناکافی ہے -

کوئی مذہب اگر معرفت الٰہی کے دروازے کھلے رکھے تو وہ مذہبی مزاج رکھنے والے تمام انسانوں کے لئے قابل قبول ہو سکتا ہے - اس سے مذہبی رواداری لازمی طور پر پیدا ہوگی اور کسی سخت گیر اور کٹر قدامت پسندی کے برعکس اعتدال پسندی کا رجحان پیدا ہوگا۔ خدا کا قرب عقل ، اخلاق یا جمال کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے - صداقت ، جمال اور خیر ایک وحدت اصلی کے تین پہلو ہو سکتے ہیں - کچھ لوگوں کو اسے ایک اخلاقی نظام کہ لینے دیجئے اور کچھ کو اجازت دیجئے کہ وہ اسے جلال و جمال کے جذباتی روپوں میں محسوس کریں ۔ کچھ کے لئے حکم مطلق فرضی حکم مطلق ہو سکتا ہے - کچھ کے لئے خدا ایک شخصی وجود ہو سکتا ہے اور کچھ ایک کائناتی روح کی صفت کے لئے شخصیت کو انتہائی محدود اور ناکافی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ وہ خدا کو ایک ایسی ماورائی روح سمجھتے ہیں جس کا ظہور شخصی اور غیر شخصی دونوں صورتوں پر حاوی اور جو خود اپنی اصل میں ان دونوں سے ماوریٰ ہو - اگر کوئی مذہب خدا کو باپ سے تشبیہ دیتا ہے تو اسے کسی ایسے مذہب پر فوقیت دینے کا کوئی جواز نہیں مل سکتا جو خدا کے لئے مالک اور آقا کے استعارے استعمال کرتا ہو - یہ تمام الفاظ اس کے مختلف پہلوؤں کے نام ہیں - یہ پہلو ایک اضافی حقیقت تو رکھتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی تنہا صداقت کا حامل نہیں ہو سکتا -

مذہبی عقیدہ بنیادی طور پر ایک عقلی تشکیل نہیں ہوتا - اگر انسانی فطرت کی گہرائیوں سے ابھرنے والی جبلّت خدا کو نہ سمجھتی اور اگر عقل سے ماوریٰ کوئی تجربہ عقیدہ کا سرچشمہ نہ ہوتا تو تنہا منطق نوع انسانی کی رہنمائی خدا تک نہ کرسکتی - مذہبی تجربات بڑے گوناگوں ہوتے ہیں ۔ جن لوگوں کو ایک اعلیٰ روحانی قوت سے قربت کا شرف حاصل ہوا ہے ان میں بہت سی باتیں ایسی رہی ہیں جو ہر مذہب کے پیغمبروں اور ولیوں میں پائی جاتی ہیں - لیکن انفرادی خصوصیات اور روایتی عقائد نے بھی بے شمار معاملوں میں تجربے کے لئے سانچے مہیا کئے ہیں ۔ اس تنوع کے باوجود ایسے عالمگیر

اور معروضی عوامل کا تلاش کر لینا مشکل نہیں ہے جو کل وجود کی روحانی بنیاد یعنی ایک روح اعلیٰ کے تمام ادراکات میں مشترک ہوں۔

خلیفہ صاحب یہ اصول واضح کرتے ہیں کہ ''ایک فرد کے لئے مذہب کو بطور معیار عمل ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنی روحانی، اخلاقی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو تا حد امکان درجہ کمال تک پہنچا سکے۔ اس کا فرض منصبی ہے کہ خالق و مخلوق اور انسان و اشیا کے باہمی ربط و تعلق کو ہم آہنگ و برقرار رکھے۔ اس کے علاوہ دنیا کے متعلق جس میں کہ انسان اپنی زندگی بسر کرتا ہے ایک صحیح انداز فکر عطا کرے،، [۹]

خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس ضابطہ کی بدرجہ اتم تکمیل اسلام میں ہوتی ہے۔ اسلام کا مطلب فانی ارادے کو وجود کی لافانی، تخلیقی اور قائم رہنے اور قائم رکھنے والی اصل کے تابع بنانا ہے۔ اور یہ وہ سچا اصول ہے کہ اس سے انحراف کرنے اور اختلاف رکھنے والا ہر نظام اور ہر عقیدہ باطل ہے۔

اسلام کیا ہے؟ یہ سوال بظاہر بڑا سادہ ہے لیکن اس سوال کا سنجیدگی سے ایسا جواب دینا بڑی دشواریوں کا باعث ہو سکتا ہے۔ ایک غیر مسلم یہ سمجھتا ہے کہ اسلام وہ مذہب ہے جس کی تبلیغ صرف آں حضرت صلعم نے کی۔ اس بات کا اظہار مغربی مصنفوں کی ان اصطلاحات سے بھی ہو جاتا ہے جو وہ اسلام کے لئے استعمال کرتے ہیں جیسے دین محمدی یا محمدیت وغیرہ۔ یہ ایک غلطی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی مذہب ایسا نہیں جو اپنے وصفی نام سے موسوم ہو۔ عیسائیت حضرت عیسیٰ سے منسوب ہوئی۔ بدھ مت گوتم بدھ کا مذہب کہلایا اور زرتشتیت، زرتشت کا دین ٹھہرا۔ مگر آں حضرت صلعم نے اس کو روا نہیں رکھا کہ جس دین کی آپ نے تبلیغ فرمائی وہ آپ کے بعد آپ کے اسم گرامی سے موسوم ہو۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ صرف میرا ہی نہیں سب کا دین ہے۔ یہی دین عیسیٰ کا تھا اور یہی دین موسیٰ کا اور لا تعداد پیغمبروں کا جو مختلف قوموں میں مبعوث ہوئے حضرت آدم سے اب تک جتنے سچے مذہبی معلم آئے وہ اسی دین کے ماننے والے تھے جس کے لئے عربی میں لفظ اسلام ہے۔ اسلام کے معنی امن اور خود کو مشیت الٰہی کے سپرد کر دینے کے ہیں۔

خلیفہ صاحب کا نظریہ ہے کہ امن و سپردگی کی زندگی کے لئے ''یہ ضروری ہے کہ پہلے ہم اپنے وجود میں ہم آہنگی پیدا کریں۔ انسان متعدد جذبات و عواطف سے سرفراز کیا گیا ہے۔ یہی اس کی زندگی کی تعمیری اور حرکی قوتیں ہیں۔ یہ بالذات شر نہیں کیونکہ ایک رحمت و شفقت والی ذات شر کو پیدا نہیں کرتی ــــ اور نہ انسان کی تخلیق کسی ایسی فطری معصیت پر ہوئی

۹۔ اسلام کا نظریۂ حیات، ۲۶۰

ہے جو اس کو اپنے مورث اعلیٰ آدم سے ملی ہو ــ ــ ــ ہر قسم کا شر عقل کے مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہونے سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ عقل ایک امتیازی ملکہ ہے جو انسان کو اپنی جبلتوں کو تابع بنانے کے لئے عطا کیا گیا ہے۔ انسان میں عقل ایک مظہر ربانی ہے اور اس کی اطاعت گویا خدا کی اطاعت ہے۔ چنانچہ اندرونی سکون حاصل کرنے کی ایک ہی راہ ہے یعنی فرمانبرداری کا کوئی عمل''۔ [۱۰] یہ فرمانبرداری اپنی ابتدائی شکل میں عقل کی ہو سکتی ہے اور انتہائی ترقی یافتہ صورت میں خدا کی۔ '' جو چیز بھی مائل بہ آویزش ہوگی وہ عدو اللہ قرار پائے گی۔ جب تک کوئی اپنے ارادہ کو مشیت کلی کے سپرد نہ کر دے وہ خود اپنی ذات سے یا دوسروں سے یا اپنے گرد و پیش سے مطمئن نہیں ہو سکتا''۔ [۱۱]

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو ایک ایسی صداقت قرار نہیں دیا جس سے دنیا آپ سے پہلے لاعلم ہو اور نہ قرآن شریف نے یہ دعویٰ کیا۔ قرآن پاک اسلام کو ایک ایسا سچا مذہب قرار دیتا ہے جو اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ نوع انسان۔ کیونکہ یہی وہ صداقت ہے جس کا نزول حضرت آدم پر ہوا اور حضرت آدم کو بعض آیتوں میں کل بنی نوع انسان کے عین کہا گیا ہے۔ قرآن میں اسلام ایک عالمگیر مذہب کے طور پر پیش کیا گیا ہے—ایک ایسے عالمگیر مذہب کے طور پر جس کا ایک لازمی اصول وحدت ادیان ہو۔ ''وحدت ادیان کے تحت وہی مذاہب آسکتے ہیں جو خدا کی وحدانیت کے قائل ہوں''۔ [۱۲] ''کیونکہ اسلام صرف ایسے مذاہب کی سچائی کو تسلیم کرتا ہے جو توحیدی ہوں۔ دیگر تمام اس کے نزدیک وحشت و جہالت کی یادگار ہیں ــ ــ ــ قرآن کہتا ہے کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے ــ ــ ــ جہاں کہیں سچا دین ہوگا وہاں نجات کی اجارہ داری نہ ہوگی۔ قرآن کہتا ہے کہ نہ ابراہیم یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، ان کا مذہب وہی ازلی و ابدی اسلام تھا۔ قرآن سچائی اور نجات کی اجارہ داری کے تمام تصورات کی بالکلیہ تردید کرتا ہے۔ نجات اور امن یہاں اور وہاں کی زندگی میں صرف اس کے لئے ہے جو خود کو خالق کائنات کے سپرد کر دے اور نیک اعمال کرے''۔ [۱۳] ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصٰرٰی والصابئین، من آمن باللہ والیوم الآخر وعمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولاخوف علیھم ولاھم یحزنون۔ جو لوگ ایمان لائے (حضرت محمد صلعم پر) اور وہ جو یہودی کہلاتے ہیں اور وہ جو نصاریٰ یا صابی ہیں، جو بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کئے تو وہ اپنے

۱۰۔ ایضاً، ۱۳۶ - ۱۳۷
۱۱۔ ایضاً، ۳
۱۲۔ ایضاً، ۲
۱۳۔ ایضاً

پروردگار سے اجر ضرور پائے گا اور ان کے لئے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی حزن و ملال ۔ ایک خدا کی پرستش کی یہی اساس اسلام کو ایک عالمگیر مذہب بناتی ہے اور اسی کو اقبال نے روحانی جمہوریت کا نام دیا تھا ۔ اسلام کا آخری نصب العین اسی روحانی جمہوریت کا قیام ہے ،، ۱۲ ۔

اسلام کا مطلب تمام حیات، تمام عالم کے ہمہ دان، ہمہ‌توان خالق اور رب پر ایمان ہے ۔ اس کا حکم ہے کہ انسان اپنے ارادے کو قوانین فطرت اور وحی کے ذریعے ظاہر ہونے والے منشائے ربانی کا تابع بنائے ۔ یہ اطاعت انفعالیت کی حالت نہیں ہے بلکہ ارادۂ الٰہی میں ایک فعّال اور با مقصد شرکت ہے ۔ ارادۂ الٰہی انسان کی فانی ہستی کو اس خیر اعلیٰ کے استعمال میں شرکت کے قابل بناتا ہے جو خدا کا منشا اور زندگی کا مقصد ہے ۔ سچا مذہب اس محکم اور ناقابل تغیّر اصل میں فانی کی طرف سے لافانی کی اطاعت کے علاوہ کچھ نہیں ۔ جو کوئی بھی اس صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے مطابق زندگی گذارتا ہے وہ مسلمان ہے ۔ اس نظریے سے جو دین بھی اختلاف رکھے گا وہ سچا مذہب نہیں ہوگا ۔

انسان اس صداقت تک اپنے حسّی تجربے یا منطقی استدلال کے ذریعے نہیں پہنچا بلکہ یہ صداقت خدا نے اپنے چند منتخب بندوں کو ایک نعمت کے طور پر مرحمت فرمائی ۔ کوئی قوم ایسی نہیں گذری جس میں خدا نے ایسے منتخب بندے پیدا نہ کئے ہوں جو انسان کو اس کے خالق کی طرف واپس لانے کے لئے ایک عالمگیر اصول کی تبلیغ نہ کرتے ہوں ۔ چنانچہ قرآن ہر ایسی ہر گزیدہ اور منتخب قوم کے نظریے کی تردید کرتا ہے جو صداقت اور نجات کی اجارہ دار ہو ۔

روح اعلیٰ کی نعمتیں اتنی ہی عالمگیر ہیں جتنے کہ طبیعی فطرت کے فوائد ۔ قرآن کے مطابق حضرت ابراہیم ، حضرت عیسیٰ سب مسلمان تھے کیونکہ رحمت اور عدل والے ایک خدا پر ایمان ان کی تعلیمات کا نچوڑ تھا ۔ ان تمام عظیم پیغمبروں نے قوموں کو الٰہی صفات کو اپنانے اور اپنے انفرادی اور اجتماعی کردار کو ان کے مطابق بنانے کی تعلیم دی ۔ قرآن میں جن پیغمبروں کا ذکر ہے وہ ان چند پیغمبروں میں سے ہیں جن سے اہل کتاب واقف ہیں ورنہ جن کا ذکر قرآن میں نہیں کیا گیا خود بقول قرآن ان کی تعداد بہت بڑی ہے کیونکہ نوع انسانی کی اس طویل تاریخ میں کوئی مدت ایسی نہیں گزری جس میں خدا کی طرف سے کوئی پیام بر نہ آیا ہو ۔ یہی سبب ہے کہ عالمگیر مذہب یعنی صداقت مشترکہ کے اجزا کم و بیش تمام اقوام میں ملینگے ۔ یہی اصلی اجزا اسلام ہیں ۔

۱۲ Khalifa A. Hakim, ''What is Islam ? '' (ایک غیر مطبوعہ مضمون)

مختلف قوموں نے اپنے روحانی قائدین کو خدا بنا لیا ہے جو درحقیقت قبائلی انداز فکر ہے جس میں ہر قبیلے کا دیوتا مخصوص ہوتا تھا ۔ قرآن شریف نے انسانوں کی اس کمزوری کی طرف توجہ دی ہے ۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے برگزیدہ بندے یعنی انبیاء ایسے لوگ تھے جن کی سطح اپنی قوم کی عام سطح سے بہت بلند تھی مگر تھے وہ انسان ہی ۔ ان عظیم افراد کی روحانی قوتوں نے ان کے پیروؤں کو گمراہ کر دیا چنانچہ وہ ان کو خدا سمجھ بیٹھے یا انہیں خدا کا اوتار بنا دیا ۔ پیغمبر اسلام کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ ان پیروؤں کو ان کی غلطی کا احساس دلائیں جو مبالغہ کی ہر حد کو توڑ نے والی تکریم کی پیداوار تھی یا پھر ان کی اس خواہش کا اظہار تھی کہ اپنے رب کو گوشت پوست کے پیکر میں دیکھا جائے ۔ قرآن شریف ان فوق الانسان ہستیوں کو خدا کا بندہ اور خادم قوم قرار دے کر اس امر کو واضح کرتا ہے کہ ایک مثالی انسان ہی انسانوں کے لئے نمونہ ہو سکتا ہے ۔ اگر خود انسانوں کی رہنمائی کے لئے خداوند ذوالجلال والاکرام نزول فرماتا تو یہ منصب پورا نہ ہو سکتا تھا ۔ ہر انسان اپنے دل میں یہی سوچتا کہ اتنے اچھے کام عاجز انسان نہیں کر سکتا صرف خدا کر سکتا ہے ۔ چنانچہ اس سبب سے انسان کا رہنما انسان ہونا ضروری ہے ۔

ایک ایسا انسان جو حق کو پانے سے پہلے اس کی تلاش میں سرگرداں رہ چکا ہو ، جسے زندگی کے تضادات اور تنازعات کا خود تجربہ ہو چکا ہو اور جو مسلسل جدوجہد سے دنیا کے مصائب کا مقابلہ کر چکا ہو ، جسے دروازہ کھولنے سے پہلے دستک دینی پڑی ہو ، جو راستے کو پا لینے سے پہلے اس کی تلاش میں رہا ہو وہی انسانوں کی قیادت کر سکتا ہے ۔

اگر ایسا کوئی انسان ابتدا ہی سے بذات خود خدا رہا ہو تو اس کی زندگی ایک ایسے انسان کے لئے کیا مثال بن سکتی ہے جو رکاوٹوں اور دشواریوں پر قابو پانا چاہتا ہو ؟ خدا کے لئے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی ۔

قرآن اپنے قارئین کو بار بار یاد دلاتا ہے کہ یہ کوئی نئی وحی نہیں ہے ، یہ صرف ایک یاد داشت ہے ۔ الہیاتی نقطۂ نظر کے لوازم پیش کرتے ہوئے قرآن پاک اپنے قاری کو یاد دلاتا ہے کہ یہ ابراہیم کا ، موسیٰ کا ، عیسیٰ کا اور ان سب پیغمبروں کا دین ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ اسی لئے صرف اسلام ہی میں وہ صلاحیت اور مثبت پہلو موجود ہیں جن پر سب انسان آ کر متفق ہو سکتے ہیں ۔